اسلام اور مغرب

تصورِ علم کا تصادم و توافق

ساجد شہباز خان
چیئرمین
شعبہ علوم المذاہب
یونیورسٹی آف سنٹرل
پنجاب، لاہور

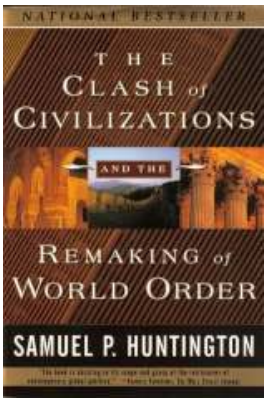

مغرب پچھلی کئی صدیوں سے عالم اسلام کے ساتھ کشمکش میں کھڑا ہے۔ خاص طور سے اگر علمی میدان کی بات کریں تو مستشرقین کی ایک لمبی فہرست ہے، جو خم ٹھوک کر نقد و جرح کے کام میں مگن ہے۔ نقد و جرح بالذات ایک مستحسن عمل ہے، کرنے والے کی نیت کچھ بھی ہو، جس پر نقد ہوتا ہے اس کے لیے سوچنے، غور کرنے اور اپنے دفاع میں نئے نئے علمی پہلوؤں کو دریافت کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ اگر مستشرقین نہ ہوتے تو ہم قرآن و حدیث اور سیرت مطہرہ کے دفاع میں ہونے والے شاندار کام سے محروم رہ جاتے۔ جس سے اسلام کی حقانیت کے نئے باب ہم پر عیاں ہوئے ہیں۔

مستشرقین کے کام کے بالاستیعاب مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی بے اعتدالیوں اور لغزشوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی علوم کو اپنے تصور علم کے تحت سمجھنے کی کوشش کی ہے جبکہ ان کا تصورِ علم اسلام کے تصور علم سے ہم آہنگ نہیں۔ ہنٹنگٹن وغیرہ نے clash of civilizations جیسی کتابیں لکھ کر یا تو اصل مسئلے سے اہل اسلام کی توجہ ہٹائی ہے، یا پھر یہ لوگ مغرب و مشرق کے اصل فرق کو نہیں سمجھ سکے۔ راقم کے خیال میں یہ clash of civilizations نہیں بلکہ یہ علمی میدان میں Clash of approaches ہے۔

استشراق اور اسلام سے تصادم

اورینٹل ازم (استشراق) بظاہر علم کی ایک شاخ ہے، لیکن حقیقت میں یہ علمی پہلو، سے کم اور عملی اور بین الاقوامی سیاست سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ فزکس، کیمسٹری، بایو کیمسٹری، ٹکنالوجی اور پولیٹیکل سائنس کا بھی اتنا تعلق سیاست سے نہیں ہو گا، جتنا اورینٹل ازم کا ہے۔ مسلمان علما نے اسے مغرب کے لادینی پراپیگنڈے، اسلام فوبیا کے مرض کا نتیجہ یا اسلام دشمنی کا شاخسانہ سمجھا، اور اس سے الگ ایک علم کے طور پر برتاؤ کیا۔ لیکن یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ پورے پلان اور اسکیم سے معاملہ کیا جاتا۔ چنانچہ یہ کاوش کچھ زیادہ سود مند نہیں رہی۔ یہ ایسا ہی معاملہ ہے کہ آپ کو ملیریا ہوا ہو، جس کا ایک اہم جزو سردی لگنا ہے، تو آپ سردی کا علاج کرتے رہیں، اور کمبل پہ کمبل اوڑھتے رہیں، لیکن ملیریا کا علاج نہ کریں۔ اس سے مرض نہیں جائے گا مگر آپ سمجھیں گے کہ میں نے تو بہت اعلیٰ علاج کیا اور نہایت عمدگی اور محنت سے تیاری داری (nursing) بھی ہوئی۔ لیکن شفانہ ہوئی۔ ہماری تمام مخلصانہ کاوشوں اور مساعی کا معاملہ بھی یہی رہا ہے۔ ہم سردی لگنے کا علاج کرتے رہے اور ملیریا مریض عزیز کی جان لے گیا۔ اس لیے اس بات کو سمجھنا از بس ضروری ہے کہ اورینٹل ازم کیا ہے، یہ محض سردی لگنا ہے، یا ملیریا ہے؟

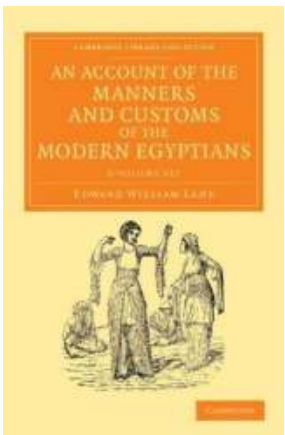

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مستشرقین نے مشرقی اقوام کا مطالعہ اس لیے کیا ہے کہ وہ ان کو سمجھ کر ان کے نفسیات کے مطابق ان پر حکومت کر سکیں۔ مثلا ایڈورڈ لین کی کتاب کا عنوان ہی دیکھ لیجیے: An Account of the Manners and Customs of the Modern Egyptian۔ بلاشبہ کسی حد تک یہ بات بھی صحیح ہے۔ لیکن صرف ایسا نہیں ہے۔ یہ دراصل مغربی پروگرام کا آدھا بیان ہے۔ کیونکہ اگر سمجھنا ہی کافی ہوتا تو بس سمجھ جاتا، نہ اسے رد کرنے کی ضرورت تھی اور نہ اس کا مذاق اڑانے کی۔ دراصل ایک اور ایجنڈا بھی ہے جسے کئی نام دیے گئے ہیں لیکن اس کا اصل نام spread of western civilization یا دوسرے لفظوں میں civilizing mission ہے۔ یہ دنیا کو مغربی انداز میں مہذب (civilized) بنانے کا مغربی ایجنڈا ہے۔ اس ایجنڈے کے ساتھ دوسرے

مقاصد بھی موجود ہیں، جیسے مغربی غلبہ کا استمرار اور مغرب کا معاشی استحکام وغیرہ۔ لیکن اورینٹل ازم جیسی چیزوں کا اصل ہدف وہی ہے جسے ہم نے civilizing mission کے نام سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں ہم دونوں ایجنڈوں کا استشراق کے ساتھ تعلق واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلا ایجنڈا اور استشراق

پہلا ایجنڈا جسے تہذیبی مشن (civilizing mission) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے نام ہی سے واضح ہے کہ اس کے پروگرام کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب، ثقافت، تہذیب، تمدن، فنون، رسم ورواج، اندازِ بود و باش، سیاست کے حوالے سے جہاں غیر مہذب عناصر پائے جائیں، ان کی جگہ مغربی "مہذب عناصر" کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جب مغرب گھر سے نکلا تو اس کا خیال تھا کہ "اچھی چیز" ہر جگہ بکتی ہے۔ لیکن تمام معاملات میں ایسا نہ ہو سکا۔ ان کی پتلون اور کوٹ تو شاید جلد بک گئے مگر ان کی بہت سی چیزیں رد کر دی گئیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں پھر انھوں نے تہذیبوں کا گہرا مطالعہ کیا کہ وہ کیا چیزیں ہیں، جو ان کی دی ہوئی "بہتر" باتوں کو ماننے میں رکاوٹ ہیں۔ اس رخ سے مطالعے کا آغاز ان کو غلط یا صحیح باتوں تک لے گیا۔ مثلاً کبھی ان کو خیال ہوا کہ جہاد کا جذبہ مسلمانوں کی طرف سے نئی باتوں کو ماننے کی راہ میں رکاوٹ ہے، کبھی خیال ہوا کہ حدیث رکاوٹ ہے اور کبھی قرآن، کبھی مسلمانوں کی تاریخ اور کبھی مدرسہ و محراب۔ اورینٹل ازم ان رکاوٹوں کو جاننے اور ان کے دور کرنے کا نام ہے۔ یعنی مہذب بنانے میں رکاوٹیں کیا ہیں، اور ان کو کیسے زائل کیا جائے۔ مثلاً پینٹ کوٹ کے اپنانے، مغربی بود و باش کے اختیار کرنے میں رکاوٹ کیا ہے؟ اسلامی تعلیمات! وہ کہاں ملتی ہیں؟ حدیث میں اور فقہ میں۔ دورِ اول کے اہل الرائے کے بعد کی تمام فقہ کی اساس اسی حدیث پر ہے، تو اصل ہدف کیا ہوا؟ ظاہر ہے حدیث۔

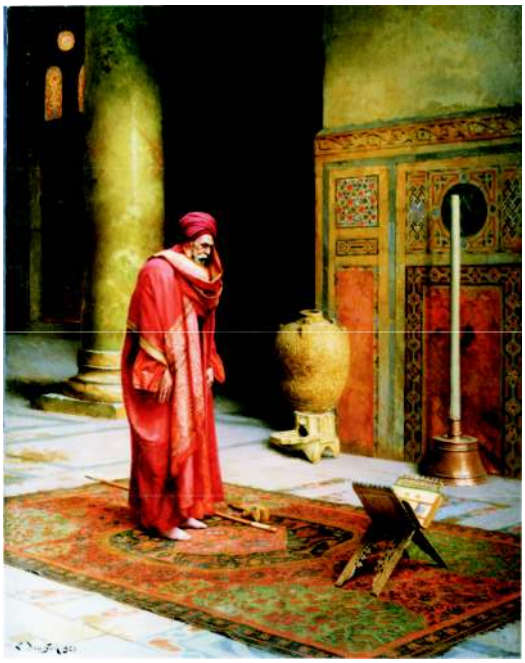

ایک اور مثال لیجیے سیکولرازم کو اپنانے میں رکاوٹ کیا ہے، ہمارا ایمان، ایمان کی اساس کیا ہے، قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو اورینٹل ازم کا ہدف کیا ہوا؟ ظاہر ہے قرآن اور نبوت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ لہٰذا قرآن اور حدیث اگر غلط ثابت ہو جائیں، اور پیغمبر محض ایک عظیم لیڈر ثابت ہو جائیں، نبوت کا مسئلہ غائب ہو جائے تو آیا تمام بڑی رکاوٹیں زائل نہیں ہو جائیں گی؟

اب اگر آپ سترھویں صدی کے بعد سے لے کر آج تک کے اسلام پر مغربی کام کا مطالعہ کریں تو آپ اسے تین نکات میں بیان کر سکتے ہیں۔

- پیغمبر اسلام کو محض ایک مخلص مصلح reformer ثابت کیا جائے، تاکہ مذہب اسلام دین کی بجائے ایک مفکر کا فکر و فلسفہ قرار پا جائے، جیسے مانی، کنفیوشش وغیرہ۔ وہ ایک مذہب کے بانی [1] ضرور ہیں، لیکن یہ مذہب نعوذ باللہ بعض ذہنی بے قاعدگیوں کا ثمر تھا، نہ کہ وحی الٰہی کا۔
- حدیث قرن ثانی وثالث کی علمی اور سیاسی سازشوں کی پیداوار ہے، اس کی پیغمبر سے نسبت ہی صحیح نہیں ہے۔
- قرآن مجید بلاشبہہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام ہے۔ لیکن اسے صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا، اور نہ صحابہ اسے صحیح ترتیب دے سکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بعض مختلف النوع کیفیات میں نبی کی وارداتِ قلبی [2] ہے۔ جو مبہم کلام کی صورت میں سامنے آتا رہا ہے، جیسا کہ مذہبی پروہتوں کا کلام مبہم ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے نئے ترجمے اور نئی ترتیب دینے کی کوششیں کی گئیں۔ (أعوذ باللہ من ان أکون منھم، اس نقل کفر پر خدا مجھے معاف کرے)۔

ان نظریات کو دوبارہ دیکھیے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب محمد بن عبداللہ خدا کے رسول نہیں ہیں تو اسلام اللہ کا دین ہی نہیں رہے گا۔ جب وہ اللہ کا دین نہیں ہے، تو اس کو بطور دین ماننے کی ضرورت اور ایمان لانے کی فکر ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح قرآن و حدیث غیر وحی اور غیر مستند یا ناقابل فہم ہیں۔ جب یہ چیز مختلف ذرائع سے ثابت کر دی جائے گی، تو اسلام بطور ایک مذہب اپنا کردار کھو دے گا۔ جس کے بعد مسلمانوں کو نئی تہذیب کی پٹی پڑھانی آسان ہو جائے گی۔

1- نبی نہیں بانی، اسلام کو Muhammadan کہنے میں بھی یہی ذہن کار فرما تھا۔

2- Epileptic fits کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا اتہام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض لاخیرے استشراقیوں نے لگایا ہے۔

ایک طرف اسلام کے ساتھ یہ کیا جارہا تھا تو دوسری طرف اہل مغرب کی بھی ایک نہایت شاندار تصویر پینٹ کی جارہی تھی۔ نہ صرف اس کام سے جسے ہم استشراق کے نام سے جانتے ہیں، بلکہ دوسرے ذرائع سے بھی یہ تصویر مسلمانوں کے ذہنوں میں پینٹ کی گئی۔ وہ تصویر یہ تھی کہ مغرب کے پاس اعلیٰ محققین ہیں، وہ مسلمانوں سے زیادہ محنتی ہیں۔ جس طرح وہاں سائنس دان صرف تجربہ سے ثابت شدہ بات کرتے ہیں، ایسے ہی استشراقی بھی تحقیق و دلیل سے بات کرتے ہیں۔ اہل مغرب مسلمانوں کے عظیم المرتب متقدمین علماء سے زیادہ محنتی اور بااصول ہیں۔ اس زمانے میں چونکہ عقل و شعور اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے، لہٰذا ایسی باتیں ان علماء کی نگاہ سے اوجھل رہیں، جو اصل میں غلط تھیں۔ مثلاً وہ استنادی مباحث میں لگے رہے اور متن پر توجہ نہ دے سکے جبکہ مغرب صحتِ فکر اور صحت منہج پر کھڑا ہے اور دقیانوسیت سے پاک ہے، وغیرہ۔ یہ باتیں استشراق کو باوزن کرنے کے لیے تھیں، اور مسلمانوں کو ان کے عروج کے دور میں بھی پسماندہ ثابت کرنے کے لیے تھیں۔

دوسرا ایجنڈا اور استشراق

دوسرا ایجنڈا جو مذکورہ بلا ایجنڈے کے لئے معاون کے طور پر کام کرتا ہے غلبہ مغرب کے استقلال و استمرار کا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ساری دنیا مغربی مصنوعات کی منڈی بن جائے، اور دوسرے یہ کہ سیاسی طور پر دیگر اقوام، یعنی مشرقی اقوام کو مغلوب رکھا جائے۔

اس کی خاطر بھی انھی چیزوں کی ضرورت تھی، جو civilizing mission میں مطلوب تھیں، لیکن یہاں ان کی صورت اور رخ اور ہے۔ مثلاً پوری دنیا ان کی منڈی بنے، اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا مغربی مصنوعات کو خریدنا چاہتی ہو۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام دنیا میں ان کی مانگ پیدا کی جائے۔ مثلاً جینز کی پتلون پوری دنیا میں فروخت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری دنیا جینز پہننا چاہتی ہو۔ میکڈونلڈ کی مانگ کے لیے ضروری ہے کہ پرانے زمانے کے گھر کے کھانے کھانے کا رواج کم ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ شوہر دیسی نخرے والا نہ رہے، بیوی کے لیے کچھ اور مصروفیات بھی ہوں، جن کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکے۔ یہ گویا سارے تمدن کی تبدیلی کے مترادف تھا۔ ان میں بھی اگر آپ غور کریں تو کچھ چیزیں مذہب سے جڑی ہیں۔ پینٹ اگر پہننا ناپسندیدہ ہے، اور مہاتما گاندھی کے لیے پورا جسم ڈھانپنا ہی ممنوع ہے تو آیا اپنی پتلون بیچنے کے لیے ایسے مذہب کو مار بھگانا نہیں ہوگا؟

اب مذہب کو مار بھگانے کے لیے سب سے مؤثر ہتھیار کیا ہوگا یہی کہ اسے غلط، ناقابل فہم، دقیانوسی، یا قدیم و فرسودہ قرار دے دیا جائے۔ یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو مذہب کا ایسا تصور پروان چڑھایا جائے جو جدید مغربی تہذیب و تمدن اپنانے کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ اس کے لیے مذہب کا ایک طرف محض روحانی اور دوسری طرف ذاتی تصور (secularism) رائج کیا گیا۔ اور اس دوسرے کی کوکھ سے محض اخلاقی (عقیدے سے مجرد) مذہب خود بخود پیدا ہو گیا، جسے Humanism کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور اسی کی گود میں الحاد (atheism) نے پرورش پائی ہے۔ گویا الحاد اور ہیومنزم جڑواں بھائی ہیں۔ مذہب کے روحانی تصور کا مطلب یہ ہے کہ چند مذہبی رسومات کے بعد آدمی دیگر مذہبی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے۔ دین کا اخلاق اور عمل صالح سے اصلاً کوئی تعلق نہ ہو۔ مذہب رہن سہن، تمدن اور بود و باش سے الگ ہو جائے۔ یہ ذہن اس بات پر جرأت دیتا ہے کہ آدمی آسانی سے ان مذہبی تعلیمات سے گریز کر سکتا ہے جو غیر روحانی قسم کی ہوں، جن کے بارے میں وہ آرام سے کہہ سکے کہ ان کے نہ اپنانے میں کیا حرج ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے بھی یہی سب سے مؤثر ذریعہ تھا کہ ان تمام تعلیمات کو فرسودہ، دقیانوسی، یا کم از کم غیر مذہبی ہی قرار دے دیا جائے۔ لہٰذا اورینٹل ازم یہاں بھی خدمت کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے صرف چند خاص تعلیمات کو ہدف بنانا ضروری تھا۔ چنانچہ عورت، لباس، فیشن، فنون لطیفہ، حدود و تعزیرات، جہاد جیسے موضوعات پر اسلام کو ہدف تنقید بنایا گیا۔ لہٰذا آہستہ آہستہ عورت آزاد ہوئی، معاشرت میں بے حساب تبدیلیاں آئیں۔ کاسمیٹکس سے لے کر فیشن تک اور میکڈونلڈ سے لے کر ٹن پیک مصنوعات تک ہر چیز کی منڈی کھل گئی۔

چلو بازار چلتے ہیں، یہاں ہر چیز بکتی ہے

اب دوسرے جزو کو لیجیے کہ سیاسی طور پر دیگر اقوام، یعنی مشرقی اقوام کو مغلوب رکھا جائے۔ اس کے لیے مسلمان ہی سب سے بڑا ہدف تھے۔ اس کی دو جہتیں ہیں:

- ایک یہ کہ عیسائیت کے علاوہ اگر کوئی مذہب اپنے ماننے والوں کی سب سے زیادہ تعداد رکھتا ہے تو وہ اسلام ہے۔ عیسائیت سے انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ سیاسی و معاشرتی نظام کے حوالے سے تعلیمات میں پہلے ہی نہایت کم سرمایہ رکھتی ہے۔ اور ویسے بھی وہ ان کا اپنا مذہب ہے۔ جبکہ اسلام اپنے ماننے والوں کو متحد کر کے کسی بھی وقت ایک ملت بنا سکتا ہے۔ اس لیے اسلام پر زیادہ توجہ دی گئی۔
- دوسری وجہ یہ کہ اہل اسلام ایک شاندار ماضی رکھتے ہیں، جب وہ تقریباً تمام دنیا پر حاکم تھے۔ یہ ماضی انھیں پھر سے آمادۂ سلطانی کر سکتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے ایسے کانٹے بوئے جائیں کہ وہ ایسا سوچ بھی نہ سکیں۔ اس کے لیے ایک تو ان کے جوڑنے والی قوت یعنی اسلام غیر معتبر کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے اندر ایسی ذہنی بے بضاعتی کا احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ از سر نو اٹھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ یہاں دیکھیے کہ پہلے کام کے لیے پھر اور سٹیٹلزم کی ضرورت ہوئی۔ اور دوسرے کام کے لیے وہی مغربی تصویر کشی کی۔

لہٰذا دونوں ایجنڈے اس قدر مشترک العمل تھے کہ ہر کام دو دھاری تلوار تھا۔ استشراق ایک طرف اسلام کو غیر معتبر کرنے کا کام کر رہا تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کے ذہن میں مغربی برتری کی دھاک بٹھا رہا تھا۔

مسلمانوں کی ذہنی و نفسیاتی تخریب

اس کام کا نتیجہ مسلمانوں کی نفسیاتی تخریب کی صورت میں نکلا۔ یہ نفسیاتی تخریب درج ذیل پہلوؤں سے کی گئی:

۱۔ یہ ذہن بنایا گیا کہ مغرب برتر اور مشرق فروتر ہے۔ یہ نفسیات تاحال قائم ہے۔

۲۔ یہ تصور دیا گیا کہ مغرب مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتا ہے۔ مسلمان سازشوں کا شکار ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں مظلوم ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ مظلوم ہونے کا احساس کام سے روکتا اور دادرسی اور خود رحمی کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔ اور اگر کوئی کام مظلوم کے ہاتھوں ہو بھی تو وہ واویلا، احتجاج اور ہنگامہ برپا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ پاکستان میں تخریبی کارروائیاں اسی مظلومانہ ذہن کی تخلیق ہیں۔ مظلوم (frustrated) ذہن اتنا تندرست سے سوچ ہی نہیں سکتا کہ دیرپا پروگرام بنا سکے۔ قرآن مجید نے اسی حالت کو مسکنت کہا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ یہ ذہن بھی بنایا جائے کہ مغرب ظالم ہے، لہٰذا انھوں نے یہ ذہن بھی بنایا۔ یہ بات اہل مغرب بھی تسلیم کرتے ہیں جیسے نوم چومسکی وغیرہ۔

۳۔ مذہبی آدمی قومی وملی امور کے نبھانے میں نکما ہوتا ہے۔ ابوالکلام کے مقابلے میں محمد علی جناح اور ظفر علی خان کے مقابلے میں لیاقت علی خان کو ترجیح حاصل ہوگی۔ آج تک انتخابات میں اسی کے نتائج دیکھے جاسکتے ہیں۔ مقبول ترین علما میدانِ سیاست میں چند ہی نشستیں جیت پاتے ہیں۔

۴۔ علم مغرب میں ہے۔ مشرق کا علمی دور ختم ہوگیا، بلکہ کبھی تھا ہی نہیں۔ علم یونان سے چلا اور فرانس و برطانیہ سے ہوتا ہوا امریکہ تک پہنچا ہے۔ مشرق کا انسانی ترقی اور علمی ارتقا میں کوئی اہم کردار نہیں ہے۔ مسلمانوں کا دور بھی بس ایک قوت کی بنا پر قائم حکومت تھی۔ جس نے شاید چند تراجم کے سوا علم کی کوئی خدمت نہیں کی۔

۵۔ دین و دنیا میں تفریق ہے۔ اس نے ناکام آدمی کے لیے زندگی کو اجیرن بنادیا ہے۔ مذہبی اقوام میں یہ چیز لامذہبیت کو رواج دیتی ہے۔ آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہم مذہب یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں، اللہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اس سوال کا تشفی بخش جواب نہ ملنے پر الحاد چپکے سے ذہن میں گھر کرلیتا ہے۔

۶۔ مغرب اخلاق میں بھی بہتر ہے۔ وہاں عدل وانصاف کا بول بالا ہے۔ انسانوں کو وہاں پورے حقوق حاصل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذہب اصل چیز نہیں ہے، یعنی مذہب کے بغیر بھی حقوق انسان کی فراہمی کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کہ وہاں کی ساری اجتماعی اخلاقیات محض مادی لین دین کی اخلاقیات ہے۔ آج ہم بھی اسی طرف بڑھ رہے ہیں۔

۷۔ مغرب آزادی کا قائل ہے۔ وہاں مذہبی رواداری پائی جاتی ہے۔ آپ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ آپ کو مذہب کے بارے میں نہیں ستائیں گے۔ یہ نہایت عمدہ پردہ ہے ان مذہب مخالف سازشوں پر جو مغرب میں ہو رہی ہے۔ یہ رواداری دراصل اس لیے ضروری تھی کہ جب لوگ مذہب کو ترک کریں تو معاشرہ انھیں تنگ نہ کرسکے۔

۸۔ مادیت کو فروغ دیا گیا، معاشرے میں نیکی کی دوڑ کے علاوہ ہر دوڑ جاری کی گئی تاکہ اصل چیز نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

۹۔ فنونِ لطیفہ، تفریح، فنکار، کھلاڑی، ان کو اتنا نمایاں کیا جائے کہ محبت وعقیدت کا رخ تبدیل کیا جائے۔ لوگ انھی کو اپنا آئیڈیل بنائیں۔ اور انھی کی راہ کو کامیابی کی راہ سمجھیں۔ پہلے یہ لوگ بدقماش سمجھے جاتے تھے، اب یہ راہنما ملت ہیں۔ عزت نیکی کو ملے، یہ تصور معاشرے سے ختم ہوگیا ہے۔

ان باتوں سے مسلمانوں کی نفسیات خراب کی گئی۔ وہ اب مظلومانہ، تھکے ہارے ذہن کے ساتھ، اس بچے کی طرح ہیں، جس پر ظلم ہو تو چیخنے چلانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ اور اگر وہ کچھ کرتا بھی ہے تو وہ بچے ہی کی طرح دبا دیا جاتا ہے، کیونکہ غم وغصے اور جلد بازی وکمزوری میں کیے گئے اقدامات ناقص ہوتے ہیں۔ مصر کی اسرائیل کے ساتھ جنگ وغیرہ اسی کی عمدہ مثال ہے۔ اس ذہن سازی میں استشراق کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ استشراق نے اس ذہن سازی میں وہ کام کیا ہے، جو ایک تناور درخت کو گرانے کے بجائے جڑوں کو برباد کرنے سے ہوتا ہے۔ یعنی بظاہر درخت اپنی جگہ کھڑا رہے اور جڑوں سے محروم کردیا جائے۔ یعنی امت مسلمہ کا تناور درخت اپنی جڑوں سے محروم کیا جارہا ہے۔ آج مذہب کا ایک ظاہری اور کھوکھلا تصور بس رہ گیا ہے۔ جس میں بصیرت اور للّٰہیت نہیں رہی۔

استشراق اور اسلام سے توافق

مندرجہ بالا گفتگو کے بعد یہ سرخی شاید بے محل لگتی ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ دراصل استشراق کی ان فتنہ گریوں کو ہم اپنے لیے مفید بنا سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے اصول کے مطابق مشکلات آتی ہیں تو یہ ہماری تطہیر[3] کے لیے آتی ہیں۔ ہمیں کندن بنانے کے لیے آتی ہیں۔ یہی اہل اسلام کا استشراق سے توافق ہے۔ مغرب ہماری خدمت کر رہا ہے کہ ہم اپنے اندر کے میل کو دھو ڈالیں اور اس میل کو نکال باہر پھینکیں، تاکہ دوبارہ کندن بن جائیں۔ ہمیں اپنی تہذیب کو اپنی نظر سے دیکھنا سیکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنے دین کو صحیح شکل میں سامنے لانا ہوگا۔ ہمیں اپنے اندر کی کوتاہیوں کو دور کرنا ہوگا تاکہ ہمیں دیکھ کر ہمارے دین کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ بقول غالب وہی حال نہ ہو کہ:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو۔

مغرب کا تصور علم اور اسلام سے تصادم

استشراق میں ایک غلطی وہ علمی کوتاہیاں اور بے ضابطگیاں ہیں جو مغرب نے علوم اسلامیہ کے ساتھ روا رکھی ہیں۔ تو دوسری غلطی تصور علم کے حوالے ہے۔ میرے خیال میں یہ تصادم کی اصل وجہ ہے۔ ہم اپنے ناقص علم کے مطابق اس پہلو پر نگاہ ڈالیں گے۔ پہلے مغرب کے تصور علم کو سمجھیں گے اور پھر اسلام کے تصور کو واضح کر کے توافق و تصادم پر بات کریں گے۔ استشراق اسی علمی بحث کا ایک جزو ہے۔ لیکن ہم نے اسے پہلے الگ سے اس لیے بیان کر دیا ہے کہ وہ ایک سیاسی طرز عمل کا شاخسانہ تھا۔ جس کا اصل میں علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس سیاسی کام کے نتیجے میں کچھ مشرق سے علمی شوق رکھنے والے لوگ بھی وابستہ ہوئے لیکن وہ اپنے پیش رووں کے اثر سے باوجود اخلاص کے بچ نہیں سکے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی اصل مآخذ تک عدم رسائی رہی تو دوسری وجہ تصور علم کا اختلاف تھا۔ ہمارے اس مقالے کا موضوع دراصل یہی ہے۔

مغرب کا تصورِ علم

گلیلیو، ڈیکارٹ، نیوٹن، ہیوم اور کانٹ کے فکر و فلسفہ نے اہل مغرب کے لیے علم ایک ایسی گتھی بنا ڈالی ہے کہ جو سلجھنے کا نام نہیں لیتی۔ ہیوم کی تشکیک کا کیا جواب ہے؟ عقل، تجربہ یا کچھ اور؟ اس سوال پر مغربی دنیائے علم میں کئی جواب دیے گئے ہیں۔ ایسا علم جو صحیح اور سچ ہو اسے عربی میں علم اور انگریزی میں truth کہتے ہیں۔ ہم اہل اسلام بھی خبر اور علم میں فرق کرتے رہے ہیں۔ علم، لغوی بحثوں میں اگرچہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وہ ظنی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اصولی بحثوں میں اسے بالعموم قطعی مانا جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ تواتر علم کا فائدہ دیتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قطعی اور سچا علم حاصل ہوتا ہے۔ اصولی بحثوں میں علم کے مقابل میں چند اصطلاحات اور متداول ہیں: جیسے خبر، جس میں احتمال صدق و کذب پایا جاتا ہے۔ ظن جس میں صدق کا احتمال کذب سے زیادہ ہوتا ہے، شک جس میں کذب و صدق کا احتمال یکساں ہوتا ہے، وھم جس میں کذب کا احتمال غالب ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مغربی فکر و فلسفہ میں knowledge خبر کے معنی میں ہے، جس میں صدق و کذب کا احتمال ہے، جب کہ truth وہ ہے جس میں صدق یقینی ہے۔ اس لحاظ سے علم الاصول کی اصطلاح: "علم" انگریزی کے علم العلم کی اصطلاح "truth" کے ہم معنی ہے۔ اور خبر اس قضیہ یا proposition کے ہم معنی ہے جو ابھی truth کے درجے تک نہ پہنچی ہو۔

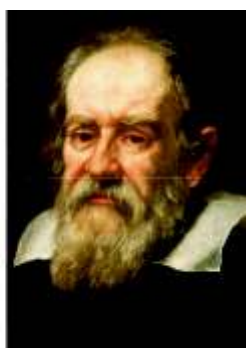

گلیلیو

ڈیکارٹ

نیوٹن

کانٹ

3- القرآن: آل عمران ۳: ۱۵۴

علم کی سچائی کا فیصلہ

اب اصل بات کی طرف آتے ہیں، جس سے اصلاً مغرب و مشرق کا فرق واضح ہو گا۔ علم یا truth کیسے ثابت ہوتا ہے۔ مغرب میں اس کے لیے چار طرح سے جواب دیا گیا ہے[4]۔

پہلا جواب: Correspondence کا نظریہ ہے۔اس نظریے کے مطابق سچا علم وہ ہے جس کی باہر والی دنیا میں تصدیق ہو جائے۔ مثلا قضیہ preposition اگر یہ ہو کہ خالد مسجد میں ہے۔ تو یہ قضیہ اس وقت درست مانا جائے گا، جب خالد کو مسجد میں پالیا گیا ہو۔ مطلب یہ کہ قضیہ باہری حقیقت سے correspond کرتا ہو یعنی مطابقت رکھتا ہو۔ اگر خالد مسجد میں نہ پایا گیا ہو، تو یہ قضیہ غلط ثابت ہو گا۔ بقول مولانا رومی:

آفتاب آمد دلیل آفتاب   گر دلیل تباید ازوی رُو مَتاب[5]

"سورج کے ہونے کی دلیل اس کا آنا ہے، لٰہذا اگر تم دلیل ہی چاہتے ہو، تو (اپنا چہرہ اسی کی طرف لگائے رکھو) ، اس سے ہٹانا نہیں، (اس کے آتے ہی تم مان جاؤ گے) "

یہ ہمارا عام انسانی طرز عمل ہے کہ ہم چیز کو دیکھ کر یا دکھا کر مان لیتے ہیں۔ عام زندگی میں تو یہ اصول بہت اچھا ہے مگر ماضی کے علم کے لیے یہ نہایت ناقص ہے۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام اُر کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر اس قضیہ کے لیے کوئی باہری دنیا میں ثبوت نہ ملے تو اس نظریے کے مطابق ہمارا یہ اجماعی نقطۂ نظر بھی غلط ہو گا، کیونکہ نہ کسی پرانی کتاب میں ملا، اور نہ اس کے دیگر شواہد ہمارے سامنے آئے۔

اسی طرح اس نظریے میں دوسری خرابی یہ ہے کہ غائب از نظر حقائق کو ماننے میں رکاوٹ بنے گا۔ یومنون بالغیب کی حقیقت اس سے اوجھل رہے گی۔

دوسرا جواب: سچ کیا ہے، اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تعقل (reason) سے اس کی صحت کو جانا جائے۔ جیسے علم کلام میں کہا جاتا ہے کہ دنیا حادث ہے اس لیے اس کا احداث کرنے والی ذات چاہیے۔ یہ استدلال ایک منطقی صغرے کبرے پر کھڑا ہے۔ پہلے یہ بات مانی گئی ہے کہ دنیا حادث ہے، پھر یہ بات مانی گئی ہے کہ ہر حادث کے پیچھے کوئی محرکِ احداث ہوتا ہے۔ ان دو عقلی مسلمات کے بل پر یہ نتیجہ نکالا گیا کہ کائنات کا خالق و محرک ہونا چاہیے۔ علم کلام جو کہ یونانی فلسفہ و منطق کی روشنی میں چلا، اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ القاضأ یا العقلیة قطعیة. یہی چیز مغربی علم میں بھی ایک حد تک مانی جاتی ہے کہ منطقی استدلال سے بھی حق ثابت ہوتا ہے۔

یہ اصول بھی واضح اور صاف ہے۔ لیکن اس میں ایک مسئلہ ہے کہ اگر یہ اصول مجرد مانا جائے اور اس کے ساتھ empirical علم کو نہ جوڑا جائے تو پھر وہی صورت سامنے آتی ہے جس کے بارے میں فلسفیوں کے لطائف مشہور ہیں کہ گھر بیٹھے بحث کرتے رہے کہ عورت کے دانت زیادہ ہیں یا مرد کے، لیکن گن کر کسی نے نہیں دیکھے۔ لیکن اس اصول کو اگر empirical ڈیٹا کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جائے تو یہ نہایت مفید چیز ہے۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی رائج ہو گئی ہے کہ سائنس عقلیت پر زور دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ سائنس اس طرح کی مجرد عقلیت کا انکار کرتی ہے۔ وہ کانٹ کی اصطلاح میں pure reasoning کی قائل نہیں ہے۔ وہ اس تعقل کو تجربے کے ساتھ جوڑنا چاہتی ہے۔ ہماری کلامی روایت کے الفاظ مستعار لیے جائے تو قضایا عقلیہ کو تجربے کی سائنس پر پرکھنے اور اس کے بل بوتے پر مستقبل کی پیشین گوئی کر کے درست ثابت ہونے کا نام سائنس ہے۔ اقبال نے شاید اسی کو ایک شعر میں دانش برہانی کا نام دیا ہے:

اک دانش نورانی، اک دانشِ برہانی   ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

تیسرا جواب: یہ دیا گیا ہے کہ وہ بات صحیح ہے جو کام چلانے کے لیے مفید ہو۔ اسے pragmatism کہا جاتا ہے۔ مثلاً بجلی کے صحیح کام کرنے کے لیے دو تاریں لگتی ہیں۔ اس لیے یہی درست ہے۔ بہت سے سائنس دان نظریہ ارتقا کو اس لیے صحیح کہتے ہیں کہ بیالوجی کے علم میں اس سے بہت مفید اضافے ہوئے ہیں۔ سادہ لفظوں میں جو مسائل کو حل کرنے میں مدد دے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا عملی استعمال کس قدر مفید ہے یہ نہیں دیکھا

4- اس کو تفصیل سے جاننے کے لیے دیکھیے epistemology کے عنوان سے لکھی جانے والی کتب، مثلا ایک بنیادی کتاب ہے:
Steup, Mathias. An introduction to Contemporary Epistemology. New Jersey: Prentice-Hall, Inc. 1998.

5- اگرچہ یہ شعر الٰہیات سے متعلق ہے، مگر اس میں correspondence کے نظریے کی جھلک ملتی ہے۔

جاتا کہ یہ بات درحقیقت صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ چیز تقلیدی مسالک میں ہمارے ہاں مانی جاتی ہے۔ سوشل سائنسز کے حوالے سے یہ مثال کہ بعض ملکوں میں جمہوریت کے بجائے ملوکیت کامیاب ہے، اس لیے اسی کو صحیح قرار دیا جائے۔ ہماری عدالتوں میں نظریہ ضرورت اسی فلسفہ کی ایک اطلاقی مثال ہے۔

چوتھا جواب: وہ ہے جسے ارتباط یا مربوطیت (coherence) کہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بات جو پورے نظام الفکر میں ٹھیک آتی ہو۔ مثلاً پرانا نظریہ کہ زمین ساکن ہے۔ موجودہ معلومات کے ڈھانچے میں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ ہمارے ہاں اس کو ایک محاورے میں بیان کیا جاتا تھا کہ: گول خانے میں چوکور میخ۔ اسی کو فلسفے میں inductive-logic بھی کہہ لیتے ہیں۔ جس میں مثلاً شرلک ہومز یا عمران کی ابن صفی کے ناولوں میں

توجیہات: جو تمام معلومات کو ملا کر ایک حقیقی مجرم تک پہنچاتی ہیں۔ وہ توجیہ اس لیے درست ہوتی ہے کیونکہ وہ عمران یا شرلک ہومز کو حاصل معلومات کے پورے ڈھانچے کو explain کر رہی ہوتی ہے۔

اسلام اور مغرب کا تفاوت

مغربی علم میں انھی چار دانشوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں تک تو مغرب و مشرق کا اتفاق ہے۔ لیکن مغرب ہم سے ایک چیز میں مختلف ہے۔ جسے ہم عقل و نقل کی ترکیب میں نقل کے نام سے جانتے ہیں۔ نقل سے بھی ایک دانش پیدا ہوئی ہے۔ اسی کو اقبال نے درج ذیل شعر میں فیضانِ سماوی کہا ہے۔ مغرب کے اس فیضان سے محروم ہونے کو علامہ اقبال نے نہایت عمدہ الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

اسلام اور مغرب کا اسی دائرے میں وہ اختلاف شروع ہوتا ہے، جسے ہم نے مقالے کے شروع میں Clash of Approaches کا نام دیا ہے۔ مغرب ان چیزوں کے علاوہ کسی پانچویں چیز کو مانے گا تو اس وقت مانے گا جب وہ ان چاروں کی طرح کی ہوں۔ ان چاروں کی نوعیت یہ ہے کہ یہ دراصل correspondence-theory کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان سب کو ہم باہری دنیا میں دیکھ یا دکھا سکتے ہیں۔ یہی وہ ظاہر پرستی ہے جس پر قرآن مجید ایمان بالغیب کو اولیت دیتا ہے،

وہ یہود کے حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھرَۃً[7] کے نظریے کو دینیات میں غلط قرار دیتا ہے۔

آپ یہاں یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ سائنس تو بعض غیبی چیزوں کو بھی مانتی ہے۔ مثلاً gravity کو کس نے دیکھا ہے۔ لیکن اس کو سب سائنس دان مانتے ہیں۔ اس لیے صرف correspondence-theory کے قائل نہیں بلکہ غیبی امور کو بھی مانتے ہیں۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ سائنس اس نظریے کو مانے گی جو تمام نظام فکر میں فٹ آئے، ٹیسٹ پر پورا اترے اور اس کی بنیاد پر مستقبل کی پیشین گوئی کی جائے اور وہ پوری ہو جائے۔ نظام فکر میں فٹ آنا، ایک نوعیت کی correspondence ہے، ٹیسٹ پر پورے اترنے اور مستقبل میں پیشین گوئی کا پورا ہونا اسی نوع کی چیزیں ہیں۔ ریزن ہماری عقل کو سمجھ آنا، ایسا ہی ہے جیسے ٹیسٹ پر مفروضے کا پورا اترنا۔

گویا اس وقت مغرب پوری طرح اس بات میں الجھا ہوا ہے کہ ہر بات کا شاہد ہونا چاہیے اور یہ شاہد محض چار قسم کے ہیں:

۱- باہر کی دنیا میں موجود ہونا: بذاتِ خود، ٹیسٹ کے نتائج کی صورت میں، پیشگوئی کے پورا ہونے کی صورت میں

۲- ہماری عقل کو سمجھ آنا

۳- مفید اور کار گر ہونا

۴- پورے نظام الفکر میں فٹ آجانا

یہ وہ شواہد ہیں جو مشہود کے ثبوت کے لیے اہل مغرب کے ہاں قابل قبول ہیں۔ یہاں مشہود دراصل صرف حواس سے غائب ہے۔ لیکن اس کے اثرات مادے پر نظر آرہے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب کا مصرعہ خوب جچتا ہے کہ (دوسرے مصرعے سے تجرد کے ساتھ)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے[8]

قرآنی نظریۂ علم

آیئے اب ایک نظر قرآن کے نظریہ علم پر ڈال لیتے ہیں۔ بالعموم کانٹ کے نظریہ synthetic-a-priori کو اہل مذہب نے پسند کیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں انسانی وجدان کو مان لیا گیا ہے۔ کانٹ کا خیال ہے کہ نہ دنیا میں محض تجربیت ہے اور نہ محض tautology ہے بلکہ ہم ہر چیز کو اپنے ذاتی علم و تجربے کی روشنی میں سمجھتے ہیں، ہمارا ذہن اپنے تشکیلات و درجہ بندیوں کو علم پر لاگو کر کے سمجھتا ہے۔ اس لیے خالص حالت میں تجربیت کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لیے کانٹ نے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یوں اس نے علم کی دنیا میں یہ بات بتائی کہ تشکیک بے بنیاد تصور ہے۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو کانٹ خود تشکیک کو مضبوط کرتا ہے۔ جب ہر شخص اپنے a priori سے دنیا کو دیکھے گا تو کیا وہ حق پر ہو گا، ظاہر ہے یہ ظن ہے۔ جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ a-priori سب کے ہاں یکساں ہے۔

تعقل کی آفاقیت

ہمارے خیال میں a priori کی کچھ صورتیں سب کے ہاں یکساں اور آفاقی ہیں، خواہ لوگ کسی بھی علاقے میں پیدا ہوئے ہوں اور ان کے تجربات کسی بھی نوعیت کے رہے ہوں۔ میں اخلاقیات سے ایک مثال دے کر بات کو واضح کرنا چاہوں گا۔ سچ اچھائی ہے، اور جھوٹ برائی ہے۔ یہ تصور ایک آفاقی a priori ہے۔ بُرے سے بُرے معاشرے میں جہاں سارا دن جھوٹ بولا جاتا ہو، وہاں بھی پوچھنے پر سچائی ہی کی توصیف ہو گی۔ یہ وہ a priori ہے جس کی بنیاد پر دنیا کا سارا گورکھ دھندا

7- القرآن: آل عمران ۲: ۵۵

8- دیوان غالب: قافیہ ن۔ اس کا دوسرا مصرعہ ہے: "حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں"۔ یہ ہمارے مضمون سے میل نہیں کھاتا، کیوں کہ اس کا تعلق وحدت الوجود سے ہے۔ ہم نے پہلے مصرعے کو دوسرے مصرعے سے مجرد کر کے استعمال کیا ہے۔

چلتا اور ہر انسان دوسرے انسانوں کے لیے قابل فہم ہے۔ حماقت کی کچھ صورتیں ہر معاشرے میں حماقت ہیں، دانائی کی کچھ باتیں ہر معاشرے میں دانائی ہیں۔ جس طرح بدیہی سچائیاں جیسے 2+2=4 ہر جگہ قائم رہتا ہے، اسی طرح کچھ ذہنی سچائیاں ہیں جو ہر جگہ قائم رہتی ہیں۔ خواہ باہر کی دنیا میں ان کو correspondence ملے یا نہ ملے۔ اس کو لسانی صلاحیت کی مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر تمام انسانوں میں یہ مشترکہ وصف نہ ہو کہ وہ منہ سے نکلنے والی مختلف آوازوں کو پہچان سکیں اور انھیں معنی دے سکیں، تو زبان اور تقریر و تحریر وجود ہی میں نہ آتا۔ اسی طرح تمام انسانوں کے پاس فہم نام کی ایک چیز پائی جاتی ہے۔ جس کے تحت وہ 2+2=4 کو سمجھ لیتا ہے، چقماق، رگڑنے اور آگ کے تعلق کو پہچان لیتا ہے۔ سیب کے گرنے اور دیگر معلومات کے مجموعے سے کشش ثقل کو تلاش کر لیتا ہے۔

تعقل کی یہ یکسانیت انسانوں نے بہت پہلے ڈھونڈ لی تھی۔ مثلاً یونانی فلسفے کی ساری بنیاد ہی اسی پر قائم رہی۔ یہ آفاقی (universal) تعقل علاقائی روایات و تصورات سے تاریخی، تہذیبی اور علمی و فنی دائرے بھی تشکیل دے لیتا ہے۔ مثلاً عام آدمی کے لیے کسی فلسفی کی یہ تشکیک کہ دنیا موجود نہیں ہے، سرے سے ایک حماقت ہے، مگر فلسفیانہ طرز فکر میں ایک علمی مسئلے کا بیان ہے۔ ذیل کا لطیفہ ہر علاقے کے لیے لطیفہ ہے:

> "ایک فرانسیسی عورت کے گھر میں پانچواں بچہ پیدا ہونے والا تھا، حمل کے دوران میں اس نے اخبار میں ملک چین کی کثرت آبادی کے بارے میں ایک خبر پڑھی کہ دنیا کا ہر پانچواں بچہ چینی ہوتا ہے۔ خبر پڑھ کر وہ حیران رہی، شام کو جب اس کا میاں آیا تو اس نے اسے کہا کہ اس دفعہ ہمارے گھر چینی بچہ پیدا ہوگا"۔

لیکن درج ذیل لطیفہ صرف اردو بولنے والے مسلمانوں کے لیے ہی لطیفہ ہے۔ اگرچہ دوسری اقوام کو بھی سمجھایا جاسکتا ہے، لیکن یہ اصلاً علاقائی ہے:

ایک روزہ دار دوسرے سے: یار، کیا سورج ڈوب گیا؟

دوسرا روزے دار بولا: نہیں ڈوبا۔

پہلا روزے دار: لگتا ہے مجھے لے کر ہی ڈوبے گا!

مختصر یہ کہ جس تعقل کی بنا پر ہم ان لطائف کو سمجھتے ہیں، اگر ان میں سے علاقائی عنصر نکال دیا جائے تو یہ تمام اقوام کے لیے یکساں قابل فہم ہوتے۔ لیکن یہ تعقل اس universal-a priori کا محض ایک جزو ہے۔ قرآن اسی یونیورسل a priori کو علم کی بنیاد بناتا ہے۔ اس کو فواد کا نام دیتا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا۔[9]

علمی میدان میں اسلام و مغرب کے اس clash میں یہی پہلی چیز ہے جو مابہ النزاع ہے۔

وحی الٰہی

دوسری چیز نزاع کا موضوع ہے۔ جسے اقبال نے فیضان سماوی سے تعبیر کیا ہے۔ کیا قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے؟ عہد حاضر میں سب سے بڑا چیلنج اسلام کو یہی درپیش ہے۔ قرآن مجید کو وحی ماننا تو درکنار خدا ہی کو منوانا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارے اہل علم کو سب سے پہلے یہی کام کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ قرآن مجید پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں علمی، تاریخی، لسانی اور سائنسی لحاظ سے غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ ہے جس کا نام 1000+ errors in Quran ہے۔ اس کا جواب دیا جائے۔ میرے مطالعہ کی حد تک ان سب اعتراضات کا شافی جواب دیا جاسکتا ہے۔ میں یہ خوش عقیدگی میں نہیں کہہ رہا، بلکہ مطالعہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔

9- القرآن: بنی اسرائیل ۱۷: ۳۶

الحاد

الحاد تیسری مابہ النزاع چیز ہے۔ جس کا ذکر ہم نے وحی کے تحت کیا ہے۔ قدیم الحاد بڑی حد تک سادہ تھا۔ مگر آج کا الحاد نیچرل ازم، عمرانیات اور فلسفہ کے زیر سایہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو چکا ہے۔ ہم دلائل کے لحاظ سے جتنا بھی بودا کہیں، وہ اپنے نظام العلم میں ٹھوس بنیاد رکھتا ہے۔ مثلاً مسئلہ شر (problem of evil) فلسفے میں ایک بڑے مسئلے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اسی طرح سائنس میں نظریۂ ارتقاء اور بگ بینگ حقائق کی طرح مانے جا رہے ہیں۔ ان کی بنیاد پر نئے نظریات قائم کیے جا رہے ہیں، جیسے یہ کہ کائنات لاشئ سے بنی ہے، اور جس طرح بنی ہے اس میں خدا کی موجودگی ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی خدا کے بغیر اس کی تخلیق اور تدبیرِ امور کی توجیہہ کچھ اس انداز میں کر دی گئی ہے کہ اب ہر علت و معلول کا رشتہ مادے سے شروع ہوتا اور مادے پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ عہد قدیم کا ممکن الوجود مادہ اب واجب الوجود بن چکا ہے، وہی خالق ہے، وہی قدیم ہے۔

الحاد کی تشہیر پر مبنی ایک سائن بورڈ

پہلے الحاد کو ماننے والوں کو سوفسطائیت کا طعنہ دے کر رد کر دیا جاتا تھا۔ اب ایسا کرنا ممکن نہیں اس لیے کہ الحاد کو اب سائنس اور ٹکنالوجی کا سہارا حاصل ہے۔ سائنس نے زندگی کے ہر میدان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف لوگوں کا سائنس اور سائنس دانوں پر اس قدر اعتماد پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے عہد میں یہ علم کا سب سے معتمد شعبہ بن چکا ہے۔ دوسری طرف سائنس کی طرف سے اس قدر مذہبی کتابوں میں مسلسل غلطیوں کی نشاندہی پر لوگوں کا مذہب پر اعتماد ختم ہو رہا ہے۔ لہٰذا الحاد ایک مضبوط نظریے کی طور پر سامنے آ رہا ہے۔ اس کو محض برا کہنے یا سوفسطائیت کا نام دے دینے سے مسئلہ حل ہونے والا نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ علمی میدان میں اتر کر اس کا مقابلہ کیا جائے اور عقل و برہان کے ذریعے سے الحاد کو رد کیا جائے یا مذہب کو ثابت کیا جائے۔ اگر دونوں کام ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔

ملاحدہ کا استدلال

اہل الحاد کے استدلال کے کئی پہلو ہیں۔ جن میں نمایاں مذہبی، تاریخی، عمرانی، فلسفیانہ اور سائنسی بنیادوں پر کئے جانے والے اعتراض ہیں۔ اب ہم ان تمام کو الگ الگ لے کر زیر بحث لاتے ہیں:

مذہبی استدلال

الحاد پرستی نے پچھلی ڈیڑھ دو صدی میں تقریباً تمام مذہبی کتابوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سائنسی بنیادوں پر بہت سی نصوص اور آیات کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ مثلاً بائبل کا انسانی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال میں بند کرنا، جبکہ سائنس ساٹھ ہزار سال پرانے انسان کا ثبوت رکھتی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید ہی کے بارے میں دیکھیں تو پوری پوری کی ویب سائٹس اس کے لیے موجود ہیں جن میں قرآن کی سائنسی، لسانی، جغرافیائی، تاریخی غلطیاں اور قرآن مجید کے داخلی تضادات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غرض ملحدین کی طرف سے ہر مذہبی کتاب کو غلط قرار دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ قرآن مجید کو شاید ان میں سب سے زیادہ نشانۂ مشق بنایا جا رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ فرعون نے جادوگروں سے کہا کہ میں تمھیں تصلیب کر دوں گا۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ مصر میں صلیب کا رواج نہیں تھا۔ یا مثلاً یہ کہ قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک دن کی لمبائی ایک ہزار سال کے برابر ہے [10]، جبکہ دوسری جگہ خود قرآن ہی ایک دن کو پچاس ہزار سال [11] کے برابر قرار دے دیتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں صراحت کی گئی ہے کہ پانچ چیزیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس میں رحم مادر میں بچہ اور بارش کا وقت شامل تھے۔ اب جب سائنس دانوں نے کم از کم ان دونوں کو جاننا شروع کر دیا ہے پہلے مسلمان ان آیتوں کو سادہ معنی میں لیتے تھے اور اب معنی بدل دیے۔ مثلاً رحم مادر میں کیا ہے؟ اس سے مراد وہ یہ لیتے تھے کہ بیٹا یا بیٹی، مگر سائنسی اعتراض کے بعد انھوں نے شقی اور سعید لینا شروع کر دیا، وغیرہ۔ اس عمل سے دراصل الحاد پرستوں نے مذہب کی بنیادیں ڈھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ خدا تو وہ ذات ہے، جس سے غلطی سرزد نہیں ہوتی اور اس کا علم کامل ہوتا ہے۔ جب ان کتب میں غلطی پائی گئی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اللہ کی کتابیں نہیں ہیں۔ جب تمام کتب جن کے الہامی ہونے کا دعوی تھا، غلطیوں سے بھری ہوئی پائی گئیں، تو یہ بات ملحدین کی حد تک پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اللہ موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اللہ ہوتا تو ان کتب میں ایسی واضح غلطیاں نہ ہوتیں۔

(أعوذ باللہ أن أکون من الجاھلین)

10- قرآن مجید ۳۲: ۵، يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ

11- قرآن مجید ۷۰: ۴، تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ

تمام اہل مذہب اس چیلنج کی شدت کا صحیح طرح سے ادراک نہیں کر پا رہے۔ بلکہ ایک محض سادہ روی سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہ سب معجزات کا انتظار کر رہے ہیں کہ شاید یہ مصیبت خود ہی ٹل جائے گی، جبکہ ایسا ہونے والا نہیں ہے۔

مذہبی استدلال کا دوسرا پہلو مذہب پرستوں کا اخلاقی اور سماجی زوال ہے۔ اس وقت بدقسمتی سے مسلمانوں سمیت تمام مذہبی اقوام خدا پر ایمان کے باوجود ناکام و نامراد دکھائی دیتی ہیں۔ خود مغرب کے غلبہ کی وجہ عیسائیت کو نہیں، بلکہ سائنس، ٹیکنالوجی اور آزادئ فکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ مذاہب بالعموم ان تینوں سے بیر رکھتے ہیں، یا کم از کم ان میں سے بعض کو پسند نہیں کرتے۔ مثلاً اسلام ہی کو دیکھیں تو وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو تو پسند کرتا ہے مگر اس میں مادر پدر آزادئ فکر کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ایک پکا مسلمان بھی ایک ایسے سائنسدان کو قبول نہیں کرے گا، جو غلط قسم کے نظریات کا حامل ہوگا۔ اس عمل کو وہ مذہب کی طرف سے سکھائی ہوئی بُری اخلاقیات قرار دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اگر مذہب یہی کچھ سکھاتا ہے تو اس کو بہتر ہے نہ مانا جائے۔ ہم دیکھو کتنے اچھے ہیں کہ ہر کسی کو سوچنے، سمجھنے اور جینے کی پوری آزادی دیتے ہیں وغیرہ۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ معجزات اور کرامات اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو اب کیوں نہیں ہوتیں۔ اب تو ہر کام اس طریقے سے ہو رہا ہے، جو سائنس کے مطابق طبعی قوانین کے ماتحت ہونا کہلاتا ہے۔ آج بھی اہل مذہب کو چاہیے کہ وہ جب انہیں بھوک لگے تو خود کھانے کے پاس جانے کے بجائے، کھانے کو اپنے پاس بلائیں۔

تاریخی استدلال

تاریخ انسانی کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ مذہب کی وجہ سے انسانوں نے انسانوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے ہیں۔ عہد عتیق سے لے کر بوسنیا اور چیچنیا تک کی تاریخ اس بات پر وہ شاہد بناتے ہیں کہ مذہب ایک خونریزی کی تحریک ہے، جس نے نسلوں کی نسلیں خداؤں کے بھینٹ چڑھادی ہیں۔ اگر مذہب حقیقی خدا یا خداؤں کا دیا ہوا ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا، اور مذہب کی اس بے رحمانہ تاریخ کی روشنی میں ہم اسے کیسے مان لیں۔

اسلامی تاریخ بھی جنگ و جدل سے بھری ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے غزوہ بدر سے لے کر سلطنت عثمانیہ کے آخری دن تک معرکے جاری رکھے ہیں۔ اسلام تلوار کے ذریعے سے پھیلا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں ایک رحمدل اور شریف انسان دکھائی دیتے ہیں، مگر مدینہ میں آکر اپنے ہی بھائیوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے، اور ایک سے زیادہ شادیاں کیں، جو عام بادشاہوں کی طرح کی زندگی لگتی ہے۔ بلکہ مدینہ میں آکر ایک نابالغ بچی سے شادی کی اور غلام بنائے اور انسانیت کی تذلیل کی۔ (اللہ مجھے اس کفر کے نقل کے گناہ سے معاف کرے۔) دیکھیے منٹگمری واٹ کی محمد ایٹ مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) (WATT 1956) صفحہ ۳۲۷ اور اس سے آگے۔

عمرانی استدلال

انسانی معاشرے کے مطالعہ سے یہ ثابت کیا جائے کہ مذہب انسانوں کی خود ساختہ چیز ہے۔ اس کی تفصیل وہ یوں کرتے ہیں کہ شروع میں انسان کو جن حالات کا سامنا تھا، وہ کچھ اس طرح کے تھے کہ وہ جنگل میں ہوتا، سورج کی تیز شعائیں اس کو جلا کر رکھ دیتیں، آندھیاں طوفان اس کو ادھر ادھر پٹختے، زلزلے اس کو دہشت زدہ کر دیتے، شیر چیتے، اس جیسے آدم زادوں کو نوچ ڈالتے، آسمانی بجلی گرتی اور سب کچھ جلا کر رکھ دیتی، انسان ان چیزوں کے خوف میں مبتلا ہوا، ان کی توجیہہ کرنے لگا، بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یا یہ تمام چیزیں خود صاحب ارادہ ہیں، یا ان کے پیچھے کوئی صاحب ارادہ ہستی ہے جو ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ جن لوگوں نے یہ توجیہہ کی یہ تمام چیزیں خود صاحبِ ارادہ ہیں، انھوں نے ان سب کو خدا مان لیا، اور جن لوگوں نے ان کے ماورا کسی ہستی کو صاحبِ ارادہ مانا، انھوں نے ان کو تو خدا نہیں مانا مگر غیر مرئی کسی ذات یا کئی ذاتوں کو خدا مان لیا۔ پھر جیسے جیسے انسانوں کے تجربات سے چیزوں کی حقیقت واضح ہوتی گئی، ویسے ویسے خداؤں کی تعداد بھی کم ہوتی گئی۔ بعض قوموں نے تین، بعض نے دو اور بعض نے ایک خدا کا تصور قائم کر لیا۔ گویا جیسے جیسے انسان کا علم بہتر ہوتا گیا، ویسے ویسے چیزوں کی حقیقت واضح ہوتی گئی اور وہ چیزوں کو خدا سے غیر خدا کی فہرست میں ڈالتا گیا۔ اب انسان کا علم جس جگہ پہنچ گیا ہے، اس نے کائنات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اب اس ارتقاء کا اگلا مرحلہ الحاد ہے۔ یعنی یہ ماننا کہ کوئی خدا موجود نہیں۔ مثلاً Diettrich Bonhoeffer (Capitan 1972) کہتا ہے:

We are proceeding towards a time of no religion at all; men as they are now simply cannot be religious any more. (p 194)

"یعنی ہم ایک لادین وقت کی طرف بڑھ رہے ہیں، آج کا انسان اب مذہبی رہنے والا نہیں ہے"۔

اس استدلال کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے:

پروٹوہیومن سے مکمل انسان بنتے بنتے، انسان کے دل میں اپنے بارے میں درج ذیل سوالات ابھرے:

- موسم کو کون کنٹرول کرتا ہے؟ سورج کو کون لاتا ہے، ستارے کس کی وجہ سے حرکت میں ہیں؟
- یہ طوفان کون لاتا ہے؟ بارش کس کے کہنے پر برستی ہے، قحط کون بھیجتا ہے؟ سیلاب کس کے حکم کے تابع ہیں؟
- زرخیزی کس کے حکم سے قبیلے کی فصلوں اور بھیڑوں اور گائیوں میں برکت دیتی ہے؟
- قبیلے کے نظام کو چلانے کے لیے کیا اصول وضوابط ہوں کہ قبیلہ پرامن طریقے سے رہ سکے؟
- سب سے بڑھ کر یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟

سائنس سے پہلے کی دنیا میں یہ سوالات جس قدر اہم تھے اسی قدر ان کے جواب دینے کے لیے کوئی راستہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ موسموں اور طوفانوں کے پیچھے کارفرما اسباب و علل کو جان ہی نہیں سکتا تھا۔ آج بھی سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود ہم آخری دو سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا جو ان سوالات کے ساتھ آج ہو رہا ہے، وہ باقی تمام کے ساتھ بھی ماضی میں ہوا۔ قبیلے کے بعض طبع آزما لوگوں نے خود اپنے خیال و وہم سے ان سوالات کے جواب دینے شروع کیے۔ یوں پہلا پہلا مذہبی تصور وجود میں آیا ہوگا۔

یہ وہ عمرانی استدلال ہے، جسے اختیار کر کے مذہب کے بارے میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ مذہب انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ قدیم انسان کے ذہنی وہم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، تو جس طرح پرانے انسان کی یہ بات غلط ثابت ہوئی کہ زمین کسی بیل کے سینگ پر نہیں ٹکی ہوئی بلکہ خلا میں تیر رہی ہے۔ اسی طرح مذہب بھی غلط تصور ہے، اس لیے کہ اسے انسان ہی نے تراشا ہے، اور اس کے تراشنے کے لیے کوئی حتمی دلیل یا شاہد اس کے پاس نہیں تھا لہٰذا یہ بھی غلط ہے۔

فلسفیانہ استدلال

اس استدلال کے دو حصے ہیں۔ ایک ان دلائل کا رد جنھیں اہل مذہب فلسفہ کے طرز و اسلوب میں پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ڈیزائن سے ڈیزائنر پر استدلال، سسٹم سے سسٹم بنانے اور چلانے والے پر استدلال۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں فلسفہ ہی کے کچھ سوالات ہیں جن کا جواب دینا ناممکن سمجھا گیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم سوال problem of evil ہے۔ اس کو فلسفی یوں بیان کرتے ہیں:

مذہب میں یہ مانا جاتا ہے کہ "خدا اچھا ہے"۔ خدا کو اچھا ماننا نہایت مشکل ہے کیوں کہ دنیا میں مصیبت ہی مصیبت ہے۔ برائی اپنی دونوں صورتوں (یعنی شر اور مصیبت کی صورت) میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر خدا اچھا ہے، اور وہ ہمارا خیال رکھتا ہے، وہ لمحہ لمحہ ہمیں دیکھ رہا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے تو ذیل کی سطور پر غور کریں:

- خدا قادر مطلق ہے۔
- خدا ہر چیز کو جانتا ہے، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ
- خدا اچھا ہے۔

لیکن چونکہ دنیا میں برائی اور مصیبت موجود ہے اس لیے تین میں سے کوئی ایک بات ہوگی۔

- خدا اس برائی اور مصیبت کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔
- اسے پتا ہی نہیں کہ دنیا میں برائی ہو رہی ہے۔
- وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اسے علم بھی ہے لیکن وہ بے نیاز ہے۔

یہ تینوں باتیں خدا کے بارے میں ہمارے تصور سے ٹکراتی ہیں، جو پہلے تین نکات کی صورت میں ہم نے بیان کیں۔ لہٰذا اس بات سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ یا ہمارا خدا کے بارے میں تصور غلط ہے یا خدا ہے ہی نہیں ہے۔

ایک جواب اور اس کا رد

اہل مذہب کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ خدا نے یہ سب ہمارے امتحان کے لیے بنایا ہے۔ اس دنیا میں برائی کا وجود ہمارے امتحان کے لیے ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا گیا کہ بچے سے کس بات کا امتحان؟ اس کو اتنی شدید تکالیف سے کیوں دوچار کیا جاتا ہے؟ اس کے جواب میں اہل مذہب کہتے ہیں کہ اس سے ماں باپ کا امتحان ہوتا ہے۔ فلسفی یہ کہتے ہیں کہ اللہ کو کوئی اور اچھا طریقہ کیوں نہ مل سکا، کہ والدین کو آزمائے؟ اتنے معصوم کو تکلیف دینے ہی کا راستہ ملا، جبکہ وہ علم و حکمت والا مانا جاتا ہے؟

غرض اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ دنیا مادے کی غیر شعوری حرکات سے اندھے طریقے پر پیدا ہوئی ہے۔ مصیبت اور برائی کی وجہ یہی ہے کہ یہ کائنات کسی ذاتِ حق کے ارادے سے نہیں بلکہ مادے کی اندھی حرکات سے پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا اتفاق سے کبھی کام اچھا ہو گیا اور کبھی ناقص رہ گیا۔ اس دنیا کا یہ نقص بتا رہا ہے کہ نہ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے نہ خدا ہی موجود ہے۔

سائنسی استدلال

سائنس مذہب کی دشمن نہیں ہے لیکن کچھ فلسفی قسم کے لوگ، اس سے کچھ ایسے نتائج نکال رہے ہیں۔ جو مذہب کو ڈھانے والے ہیں۔

طبعی قوانین کی حاکمیت

سائنس پچھلی چند دہائیوں سے اس بات پر مصر ہے کہ یہ دنیا حکم الٰہی سے نہیں بلکہ طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ مثلاً نمک کی خاصیت یہ ہے کہ وہ چیزوں کو نمکین کرے گا، اور نمک سوڈے کے ساتھ مل کر جھاگ بنائے گا اور جوش دکھائے گا، جیسے سوڈا واٹر کی بوتل میں نمک ڈالنے سے ہوتا ہے۔ جب بھی سوڈا، پانی اور نمک اکٹھے ہوں گے، یہ ان میں جوش آئے گا۔ خواہ یہ تینوں چیزیں ہوا سے اڑ کر اکٹھی ہو جائیں، یا ایک انسان ایسا کرے۔ غرض یہ کہ سوڈے کے جوش مارنے کے لیے ایک عاقل کی مداخلت ضروری نہیں۔

مادے کے یہ خصائص بگ بینگ کے وقت خود ہی پیدا ہو گئے تھے۔ کیوں کہ جس طرح دھماکا ہوا اور اس میں جس طرح سے ٹھنڈا ہونے پر پہلے مادے کے پارٹیکل بنے اور پھر ان کے بے ترتیب جڑنے پر ایٹم بنے۔ اس سے مختلف النوع مادے بنتے چلے گئے۔ ان کے اندر خود بخود جڑنے کی وجہ سے پروٹان اور نیوٹران اور الیکٹران کی تعداد مختلف تھی، ان کے اختلاف کی وجہ سے مادے کے ذرات کی خصوصیات مختلف ہوتی چلی گئیں۔ ایک سو تین کے قریب مختلف قسم کے مادے وجود میں آ گئے۔ جنھیں ایلیمنٹس یا عناصر کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد انھی کے باہمی تعامل سے باقی کام ہوتے چلے گئے۔ مادہ ٹھنڈا ہوتا گیا اور اس کے کئی روپ سامنے آتے چلے گئے۔ مختلف درجہ حرارت، مختلف مادوں کی موجودگی، پانی وغیرہ کی موجودگی یہ وہ امور تھے، جن کے مختلف ہونے کی وجہ سے چیزیں بھی مختلف بنتی چلی گئیں۔ غرض Stephen Hawking کے بقول یہ کائنات نہ ہونے سے ہونے میں خود بخود آ گئی، اور چل بھی رہی ہے۔ جس طرح اس کے بننے میں مادے کے خصائص کی کارفرمائی ہے، ویسے ہی اس کے چلنے میں مادے ہی کی کارفرمائی ہے۔ مثلاً زمین و سورج اور چاند ستاروں کی باہمی کشش اور ان کی قوتِ حرکت جو بگ بینگ کے دھماکے سے وجود میں آئی تھی، اس نظام کے قیام کا ذریعہ ہے جسے سولر سسٹم اور بڑے پیمانے پر کائنات کہتے ہیں۔

زندگی کے اسی مادے کے اندر سے کاربن، نائٹروجن اور بجلی کی قوت سے وہ ابتدائی خلیے بنے جو پروٹین وغیرہ کے بننے میں کام آتے ہیں۔ یوں سمندر کے کسی گوشے میں اچانک زندگی نے جنم لے لیا ہوگا، اور اربوں سالوں کا سفر کر کے وہ مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی انسان کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ جو ابھی تک زندگی کی سب سے ترقی یافتہ صورت ہے۔

ان دونوں کے لیے سائنسدانوں کے پاس بظاہر ناقابلِ تردید شواہد ہیں۔ وہ ان شواہد کو اس رنگ میں پیش کرتے ہیں، جس سے کائنات کا خود بخود پیدا ہونا، اور چلتے رہنا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح fossils کی شکل میں موجود زندگی کی باقیات کو وہ اس ترتیب اور تناظر میں پیش کرتے ہیں کہ نظریہ ارتقاء ثابت ہو جائے۔

نفسیات سے استدلال

فرائڈ کی نفسیاتی دریافتوں سے لے کر آج تک جو نظریات بھی پیدا ہوئے ہیں، ان میں یہ تصور کافی غلبہ پائے ہوئے ہے کہ انسانوں کے اندر نیکی بدی کا تصور موجود نہیں ہے، بلکہ یہ صدیوں کی اجتماعی زندگی ہے، جس نے کچھ اصولوں کی شکل اختیار کی اور اخلاقیات وجود پذیر ہوئیں۔ یہ کوئی خدائی فیصلہ نہیں ہے، بلکہ سماجی تصور ہے۔ جسے نسل در نسل انسان اپنے بڑوں سے سنتے آئے ہیں، یہ بھی اساطیر الاولین ہیں۔ انسان چونکہ سیکھنے والا جانور ہے، لہٰذا اس نے ماں باپ سے اس سبق کو سیکھ کر اپنے مافی الضمیر کا حصہ بنالیا، حالانکہ یہ اس کے ضمیر میں نہیں تھا۔ یہ super-ego ہے، جسے ہمارا سماج ہمیں سکھاتا ہے۔ اس تصور کو مانتے ہی تمام اخلاقیات ٹریفک کے قانون کی طرح سے غیر الٰہی، غیر ضروری اور غیر ابدی قانون بن کر رہ جاتی ہیں۔ جس کی ضرورت صرف ٹریفک کے چلنے کی صورت میں ہے ویسے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کہ اس کے لیے دین کو تخلیق کیا جائے۔

اسی غیر اخلاقی قانون کو پرانے وقتوں میں مذہب کا رنگ دیا گیا تھا۔ اب یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس اخلاق کی حیثیت اب روسو کے معاہدۂ عمرانی سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اسے نہ دین سمجھو، نہ دین کی طرح خیال کرو کہ یہ کوئی اخروی نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ تو محض زندگی گزارنے کا ایک ایسا طریقہ ہے، جس میں انسان باہمی ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

ذرائع علم کا مسئلہ

دورِ حاضر میں ذرائع علم کو مادی تجربیت کے تحت محدود کر دیا گیا ہے۔ ایسے کسی ذریعہ علم کو نہیں مانا جاتا، جس کے بارے میں دوسروں کو قائل کرنا ممکن ہو۔ مثلاً وجدان کے تحت اگر کوئی شخص اگر ایک چیز محسوس کر رہا ہے، تو وہ دوسرے کو کیسے بتائے۔ مثلاً سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹے جب ان کے پاس قمیصِ یوسف لے کر آتے ہیں، تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ گویا یوسف آرہے ہیں، تو اس احساس کے تحت وہ فرماتے ہیں کہ (اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ) میں یوسف کی مہک کو محسوس کر رہا ہوں۔ اس کو بعض علما وجدان کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اچھی مثال ہے، مگر اس کو دوسروں کو کیسے منوائیں۔ حضرت یعقوب جیسا بزرگ نبی اور سچا انسان بھی اپنے گھر والوں کو بھی یہ بات نہ منوا سکا۔ لہٰذا وہ بولے: تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ، باخدا آپ تو وہ وہی پرانی بھٹکی بات میں پڑے ہوئے ہیں۔ گویا ان کے اہل خانہ نے بھی اس وقت بات مانی ہو گی جب برادران یوسف ان کا کرتہ لے آئے۔

رہا وحی کے بطور ماخذ علم ہونے کا مسئلہ تو ملحدین نے جیسا ہم نے اوپر عرض کیا، الہامی کتب میں اپنے تئیں غلطیاں نکال کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وحی کے نام سے پیش کی جانے والی کتب غلطیوں اور تضادات سے بھرپور ہیں، چونکہ خدا غلطی نہیں کر سکتا اس لیے یہ اللہ کی کتب نہیں ہیں۔ چنانچہ نہ خدا ہے، نہ خدا نے وحی کبھی نازل کی ہے۔ اس لیے یہ کوئی ماخذ علم نہیں ہے، اگر یہ کتابیں ماخذ علم ہیں بھی تو ان میں غلطیاں ہیں۔ لہٰذا ان سے یقینی معنی میں سچا علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً وہ قرآن مجید فرقان الحمید کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ پرانے انسان کے فہم کے مطابق زمین کے ساکن ہونے اور سورج کے گردش میں ہونے کا قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں زمین کے چلنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ الحادِ نو اس بات کو پوری قوت کے ساتھ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وحی کے نام سے موجود کتب قابلِ استناد نہیں ہیں۔ بلکہ (نعوذ باللہ) وہ اغلاط وتضادات کا مجموعہ ہیں۔

مذہب کے متبادلات

مذہب کا انکار کر کے ایک خلا پیدا ہوتا ہے لیکن الحاد نے اپنے پرپرزے کچھ اس طرح نکالے ہیں کہ یہ خلا پیدا نہیں ہونے دیا گیا، بلکہ انسانوں کو غیر شعوری طور پر پچھلے دو سو سال سے ایسے نظریات دیے ہیں جو مذہب خلا کو پر کرتے ہیں۔ یوں مذہب کے متبادل کے طور پر انسانی وجود کو سامانِ تشفی فراہم کرتے ہیں۔ ان متبادلات کا فائدہ الحاد کو یہ ہے کہ انسان کی فطرت اگر مذہب کی پیاس محسوس کرے تو اصل پانی پلانے کے بجائے غلط طریقے سے اس کی پیاس بجھادی جائے، تاکہ وہ مذہب کا مطالبہ نہ کرے۔ اس اصول پر کہ انسان کو جو پیاس اصل میں صحیح مذہب کی ہے، لیکن وہ باطل مذاہب سے بھی اپنی یہ پیاس بجھالیتا ہے۔ اگر بت پرستی انسان کی دینی پیاس بجھا سکتی ہے تو پھر یہ تازہ افکار بھی انسان کی مذہبی پیاس کو بجھا سکتے ہیں۔ لہٰذا اس مقصد کے تحت درج ذیل نظریات کو شمار کیا جا سکتا ہے، جو مذہب کی پیاس کو بجھاتے ہیں، اور ان کے ہوتے ہوئے انسان کسی مذہب کی ضرورت محسوس نہیں کرتا:

۱۔ قومیت یا وطنیت

ملت کا جو شعور ایک مذہب دیتا ہے، اس کی اگر کوئی چیز متبادل ہو سکتی ہے، تو وہ وطنیت یا قومیت ہے جس کی طرف اقبال نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کا یہ احساس غلط نہیں ہے اس لیے کہ اقبال کے ساٹھ ستر سال بعد اب یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ بہت سے افکار نے مل کر مذہب کے متبادلات فراہم کیے ہیں۔ جن میں سے ایک یہی وطنیت ہے۔ بظاہر حب الوطنی ہر قوم اور ہر نسل کے لیے ایک جذبہ و تحریک کا سامان ہے مگر اس کی لے اگر اتنی بڑھادی جائے کہ وہ مذہب کی جگہ لے لے تو اس کے معنی کچھ اور ہیں۔

۲۔ معاہدۂ عمرانی اور حقوق انسانی کا چارٹر

دین معاملات میں حقوق و فرائض کی بات کرتا ہے۔ اسلام، یہودیت اور عیسائیت چونکہ الہامی مذاہب ہیں، اس لیے ان میں ان حقوق کا تذکرہ سب مذاہب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ روسو کا معاہدۂ عمرانی اور اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر جیسی چیزیں دراصل اس ضمانت کا متبادل ہیں، جو مذہب کی طرف سے حاصل ہوتی تھی۔ خدا کی ضمانت کو اقوام متحدہ اور معاہدہ عمرانی کے تحت عوام کے لیے حکومت کی طرف یہ ضمانت دراصل مذہب سے بے نیاز کرتی ہیں۔ جس مقصد کے لیے لوگ مذہب اور آیاتِ الٰہی کا حوالہ دیا کرتے تھے، اب اس کی جگہ اقوام متحدہ کے چارٹر کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

۳۔ قانون

تمام ادیان اپنے ماننے والوں کے لیے شرائع تشکیل کرتا ہے، تاکہ ان کی روزمرہ کی زندگی منظم ہو اور ان کو حدود و قیود کا پابند کر کے پُرامن انسان بنایا جائے، تاکہ وہ ایک اچھا باپ، شوہر، بھائی، ہمسایہ، افسر، اور حکمران بن سکے۔ اہل مغرب نے ان تمام چیزوں کے حل کے لیے قانون کا سہارا لیا ہے۔ اب باپ اپنے بچوں پر شفقت اس لیے کرے گا—فطری محبت کے ساتھ ساتھ— کہ کہیں قانون اسے گرفت میں نہ لے اور اس کی اولاد اس سے چھین نہ لی جائے، اور بیٹا اب دین کی تلقین کے مطابق باپ کی ڈانٹ کو نہیں سنے گا، بلکہ وہ اس کے خلاف قانون کا سہارا لے سکے گا۔ تمام آداب و شرائع سے حاصل ہونے والے تحفظ کی جگہ اب قانونی تحفظ کو حاصل ہو گی۔

۴۔ انسانی مرکزیت (humanism)

انسان کے اندر نیکی کا جذبہ فاطرِ ارض و سما نے رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ نیکی کو پسند کرتا اور برائی سے اصلاً نفرت کرتا ہے۔ انسان اپنی اس فطری اپج کی تسکین کئی طریقوں سے کرتا ہے۔ اسلام نے اس کے لیے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ایک متوازن نظام دیا ہے۔ لیکن اب تمام نیکی کو ایک ہی نام دیا جا رہا ہے، وہ ہے انسان کا تحفظ و فلاح جس کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر مرکزی حیثیت دی جا رہی ہے۔

۵۔ سوشل ورک

انسانوں کی خدمت ہر مذہب میں موجود رہی ہے۔ بھوکے کو کھلانا، مسافر کی مدد، غریب کی مدد یہ ہمیشہ سے ادیان بالخصوص ادیان ابراہیمی میں پوری آب و تاب سے موجود رہی ہے۔ لیکن انسانوں کے ساتھ اس ہمدردی کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ اور عبادات کا ایک نظام بھی موجود رہا ہے۔ اب سوشل ورک کی اہمیت کو بین الاقوامی سطح پر بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس نیکی کے کرنے کے لحاظ سے یہ ابھی بھی کم اہمیت ہے، لیکن ہم جس پہلو سے بات کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ انسان کے نیکی کے جذبے کی تسکین اب اسی سے کی جائے گی۔ انسانی فطرت کا یہ خاصا ہے کہ وہ غیر متوازن طریقے سے بھی اپنے جذبہ کی تسکین کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر وہ

حقوق العباد پورے کرتا رہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی فطرت اسی پر اتنی مطمئن ہو جائے کہ وہ حقوق اللہ یا عبادتِ خدا کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔اس کی ایک عام مثال ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہے کہ بالعموم نماز روزے کا اہتمام کرنے والے سماجی نیکیوں میں کمزور ہوتے ہیں۔وہ معاشرتی اصلاحی کاموں میں کم ہی حصہ لیتے ہیں۔بسا اوقات ان کو اخلاقی میدان میں بھی کمزور پایا گیا ہے۔اس اصول پر سوشل ورک کرنے والے لوگ اپنے جذبۂ عبادت میں کمزور ہوتے ہیں،اس لیے کہ اس نیکی کا احساس ان کی دوسری نیکیوں کی پیاس کے لیے پانی کا کام کرتا رہتا ہے۔لہٰذا NGOs دراصل معابد کی جگہ لیتی جارہی ہیں،اور سوشل ورک عبادت کی۔

۶۔سیاسی جدوجہد

انسانی حقوق کی جنگ کے میدان میں جو جدوجہد سیاسی میدان میں کی جاتی ہے،یا انقلابی نوجوانوں کی جدوجہد بھی سوشل ورک کی طرح عبادت کے جذبے کی تسکین بھی کرتی ہے۔

۷۔نواصنام پرستی neo-paganism

نواصنام پرستی کا مظاہرہ

انسان کی فطری تشکیل کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ غیبی چیزوں کو مانتا ہے۔لوگ اسی فطرت کی بنا پر توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔بھوت پریت، جادو، اور غیبی قوتوں اور ان پر قابو پانا وغیرہ اسی فطرت سے پیدا ہونے والے باطل امور ہیں۔اسی سے لوک اور مذہبی داستانیں وجود میں آتی تھیں۔انسان کا یہی وہ رخ ہے جو (mythology) کو وجود پذیر کرتا ہے۔لیکن انسان کی یہی فطرت ہے جس کی وجہ سے وہ عقیدہ کو ماننے کے قابل ہوتا ہے۔انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کی یہ فطرت بھی باطل امور پر یقین رکھ کر مطمئن ہو جاتی رہی ہے۔بلکہ لگتا یہی ہے کہ عجوبہ قسم کی باتوں سے اس کی اس فطرت کی تسکین زیادہ ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب امریکہ اور یورپ میں ایسا ادب تخلیق کیا جارہا ہے،جو ان چیزوں کو mythology بتائے بغیر انسان کی اس عجوبہ پسندی کی تسکین کرے گا۔اس مقصد کے لیے فلمیں،ناول،ڈرامے وغیرہ تیار کیے جارہے ہیں۔

اس کے علاوہ قدیم زمانے کے باطل خداؤں کو دوبارہ نئی صورتوں میں سامنے لایا جارہا ہے۔

یہ ایک مختصر فہرست ہے، جس میں بہت سی باتیں یقیناً اور بھی ہوں گی۔جو انھی متبادلات کا کردار ادا کرتی ہوں گی۔ لیکن ہم یہاں اسی بات پر اکتفا کریں گے کہ انھیں بطور مثال سمجھا جائے کہ کس طرح کی چیزیں انسان کو مذہب کی ضرورت سے بے نیاز کرتی ہیں۔

ہماری ذمہ داریاں

- مضمون پہلے ہی طوالت کا شکار ہو چکا ہے۔اس لیے ذمہ داریوں کو ہم نکات کی صورت میں بیان کریں گے:
- ہمیں اپنے علمی نظریات کو objectively بیان کرنا ہے،یعنی اس طرح سے بیان کرنا ہے کہ یونیورسل تعقل اسے سمجھ سکے۔
- ہمیں خدا کے ثبوت کے لیے قرآنی طرز استدلال کو دریافت کرنا ہے اور اسے correspondence ذہنیت کے لیے قابل فہم بنانا ہے۔
- ہمیں مستشرقین کے اعتراضات کے جواب دینے ہیں اور دیتے چلے جانا ہے۔
- ابھی تک جتنے جواب دیے گئے ہیں،ان کا محاکمہ کر کے مضبوط جوابات کو یکجا کر کے قابلِ رسائی بنانا ہے۔

مغرب سے علمی میدان میں توافق کی صورتیں

- تصور علم،الحاد اور استشراق کو چھوڑ کر باقی علمی میدان میں ہمیں مغرب سے کوئی چپقلش نہیں۔
- سائنس کی دنیوی خدمات کے ہم معترف ہیں۔
- تحقیقی دنیا میں آزادانہ مگر دیانت دارانہ طرز فکر کے ہم معترف ہیں۔
- کمپیوٹر،انٹرنیٹ اور ڈیٹا بیس سافٹ ویئر کی فراہمی کے ہم معترف ہیں۔جس نے تلاشِ مواد کو بہت آسان بنا دیا ہے۔

- پیور سائنسز کے ساتھ ساتھ سوشل سائنسز میں اختلافات کے باوجود ان کی فتوحات کے ہم معترف ہیں۔
- نظریۂ ارتقاء کے سوا کسی سائنسی نظریے سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔نظریۂ ارتقاء میں اگر انسان کو اس پر پیش نہ کیا جائے تو پھر اسلام کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ماقبل انسان حیوانات میں ارتقاء کے خلاف قرآن وسنت میں کوئی نص موجود نہیں ہے۔بلکہ ہمارے بعض قدیم مفکرین اس ارتقاء کے قائل بھی رہے ہیں۔ وماتوفیقی الا باللہ

Bibliography

- Capitan, William H. "Philosophy of Religion An Introduction." New York: Pegasus, 1972.
- Edward William Lane,"An Account of The Manners and Customs of the Modern Egyptians." London: WILLIAM CLOWES AND SONS, STAMFORD STREET., 1860.
- Hutington, P.Samuel."The Clash of Civilizations and The Remaking of the World Order." New York: Simon & Schuster Paperback, 1996.
- Steup, Matthias."An Introduction to Contemporary Epistemology." New Jersey: Prentice-Hall, Inc., 1998.
- WATT, W. MONTGOMERY. "Muhammad at Medina." London: OXFORD, AT THE CLARENDON PRESS, 1956.